GIRRAJ GOVT COLLEGE(A)

NIZAMABAD

DEPARTMENT OF URDU

STUDENTS STUDY PROJECT IN URDU

TOPIC

غالب شخص اور شاعر

GHALIB SHAKHS AUR SHAER

SUPERVISED BY **SUBMITTED BY**

Dr M Aslam Faroqui **BA I Year U/M Students**

DEPT OF URDU -2017

GIRRAJ GOVT COLLEGE (A) NIZAMABAD

DEPARMENT OF URDU

CERTIFICATE

This is to certify that the students study project entitled " Rubaiyat e Amjad Hyderabadi Aur Un ki Asri Manviyat" is an original work carried out by bonafide students of BA I year U/M sutdents in the academic year 2016-17 under the supervision of Dr Mohd Aslam Faroqui Head Dept of Urdu Girraj Govt College(A) Nizamabad.

Project Presenters

BA I year U/M sutdents

S.NO	NAME OF THE STUDENT	ROLL NO
1	Afreen Begum	1605-5005-902
2	Farzana Begum	1605-5005-905
3	Muniba Nida	1605-5005-909
4	Nousheen Anjum	1605-5005-910
5	Tabassum Begum	1605-5005-928
6	Irshad	1605-5005-90

Supervisor Principal

غالب شخص اور شاعر

تحقیقی پراجکٹ کا تعارف:

''غالب شخص اور شاعر''، تحقیقی پراجکٹ کے تحت اردو کے نامور غزل گو شاعر مرزا غالب کے حالات زندگی، ان کی شخصیت، ان کے شعری اور نثری کارناموں اور ان کی شاعری کا تعارف اور تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ اس پراجکٹ کے تحت غالب کی منتخب غزلوں کا مطالعہ بھی پیش کیا جائے گا۔

نجم الدولہ، دبیر الملک، مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب بہادر نظام جنگ (1797 پیدائش-1869ء وفات) اردو زبان کے سب سے بڑے شاعروں میں ایک سمجھے جاتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ 19 ویں صدی غالب کی صدی ہے۔ جبکہ 18 ویں میر تقی میر کی تھی اور 20 ویں علامہ اقبال کی۔ غالب کی عظمت کا راز صرف ان کی شاعری کے حسن اور بیان کی خوبی ہی میں نہیں ہے۔ ان کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات کو گہرائی میں جا کر سمجھتے تھے اور بڑی سادگی سے عام لوگوں کے لیے بیان کر دیتے تھے۔ غالب جس پر آشوب دور میں پیدا ہوئے اس میں انہوں نے مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت کو برباد ہوتے ہوئے اور باہر سے آئی ہوئی انگریز قوم کو ملک کے اقتدار پر چھاتے ہوئے دیکھا۔ غالباً یہی وہ پس منظر ہے جس نے ان کی نظر میں گہرائی اور فکر میں وسعت پیدا کی۔

تحقیقی پراجکٹ کی اہمیت:

''غالب شخص اور شاعر''، تحقیقی پراجکٹ اردو کے نامور شاعر مرزا غالب کی حیات اور کارناموں کا خلاصہ پیش کرے گا۔ غالب شناسی میں اس پراجکٹ کی اہمیت ہوگی اور اردو کے طالب علم غالب کی حیات، ادبی کارناموں اور ان کی شاعری کے بارے میں جان سکیں گے۔

طریقہ کار:

اس تحقیقی پراجکٹ میں انٹرنیٹ اور دیگر کتابوں سے غالب کے حالات زندگی، شخصیت ان کے کلام کا انتخاب اور ان کی شاعری کی خصوصیات سے متعلق مواد جمع کیا جائے گا اور اس کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

غالب کے حالات زندگی:

اردو غزل کے نامور شاعر مرزا غالب کا نام اسد اللہ بیگ خاں تھا۔ باپ کا نام عبد اللہ بیگ تھا۔ آپ دسمبر 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ غالبؔ کے آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ لیکن غالبؔ نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ غالب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے کی لیکن آٹھ سال کی عمر میں ان کے چچا بھی فوت ہو گئے۔ نواب احمد بخش خاں نے مرزا کے

خاندان کا انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرادیا۔ 1810ء میں تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی نواب احمد بخش کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراء بیگم سے ہوگئی شادی کے بعد انہوں نے اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ غالب کی اولاد میں کوئی نہیں بچ سکا۔ سات بچے بچیوں کی ولادت ہوئی لیکن کوئی بھی 15 ماہ سے زیادہ عمر نہ پا سکا۔ شادی کے بعد مرزا کے اخراجات بڑھ گئے اور مقروض ہو گئے۔ اس دوران میں انہیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور قرض کا بوجھ مزید بڑھنے لگا۔ آخر مالی پریشانیوں سے مجبور ہو کر غالب نے قلعہ کی ملازمت اختیار کر لی اور 1850ء میں بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب عطا فرمایا اور خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا اور 50 روپے ماہور مرزا کا وظیفہ مقرر ہوا۔ غدر کے بعد مرزا کی سرکاری پنشن بھی بند ہوگئی۔ چنانچہ انقلاب 1857ء کے بعد مرزا نے نواب یوسف علی خاں والی رامپور کو امداد کے لیے لکھا انہوں نے سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو مرزا کو تادم حیات ملتا رہا۔ کثرت شراب نوشی کی بدولت ان کی صحت بالکل تباہ ہوگئی مرنے سے پہلے بے ہوشی طاری رہی اور اسی حالت میں 15 فروری 1869ء کو انتقال فرمایا۔ غالبؔ کا انتقال دہلی میں ہوا اور وہ درگاہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے احاطہ میں دفن ہیں۔ غالب کی بیوی امراؤ بیگم بھی 4 فروری 1870ء۔ ،کو اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

غالبؔ نے اردو غزل گوئی میں اپنا الگ مقام بنایا وہ دوسروں کی راہ پر چلنے سے کتراتے تھے۔ ابتداء میں فارسی میں شاعری کرتے رہے۔ بعد میں اردو شاعری کی۔ غالب کا اردو دیوان مختصر ہے۔ لیکن اسے عالمی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ موضوعات اور انداز بیان میں جدت' شوخی' ظرافت اور دیگر زبان و بیان کی خوبیاں انہیں اردو کا ایک منفرد شاعر بناتی ہیں۔ غالبؔ نے بغیر القاب و آداب استعمال کئے آپسی گفتگو کی طرح خط لکھے جو بہت مشہور ہوئے۔ مجموعی طور پر غالب نے اردو شاعری کو نئی فکر عطا کی اور آج بھی ان کی شاعری سے نئے مفاہیم تلاش کئے جارہے ہیں۔

مرزا غالب کی شخصیت:

غالبؔ کے اخلاق نہایت وسیع تھے وہ لوگوں سے کھلے دل سے ملتے تھے۔ لوگ اُن کے برتاؤ سے اس قدر متاثر ہوتے کہ جو شخص ایک دفعہ ان سے ملتا بار بار اُن سے ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔ غالبؔ دوستوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور اُن کی خوشی اور غم میں اپنے آپ کو شامل رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقہ احباب اور دوستوں میں دہلی اور ملک بھر میں مذہب وملت کے کئی لوگ شامل تھے۔ غالبؔ جن دوستوں کو خط لکھتے ان میں محبت کا اظہار کرتے وہ ہر خط کا جواب دیتے تھے ان کا بہت سا وقت دوستوں کو خط لکھنے میں گذرتا تھا۔ بیماری کی حالت میں بھی خط لکھنا نہیں چھوڑتے تھے۔ اگر کوئی بے رنگ خط بھیجتا یا لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تو وہ ناراض ہو جاتے۔ وہ لوگوں سے مروت اور لحاظ کا اظہار کرتے۔ اخیر عمر میں اشعار کی اصلاح سے معذرت کرنے لگے تھے۔

غالبؔ کی آمدنی کم تھی لیکن وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی جہاں تک ہو سکے بھرپور مدد کرتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی ڈیڑھ سو روپئے ماہوار تھی۔ اس میں سے بھی ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے۔ مدد کیلئے انہوں نے اپنے انعامات بیچنا بھی گوارا کیا۔

دہلی کے علمائیدین میں کچھ لوگ حالات کا شکار ہوکر غریب ہوگئے تھے اور عزت کی خاطر کسی سے مانگنے سے شرماتے تھے۔ غالبؔ غیر محسوس طریقے سے ان لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ اسی طرح اک عمائد سے ان کا کم قیمت فرغل لے کر اپنا قیمتی کپڑا دیا۔

حالیؔ مرزا کے حافظے اور ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالبؔ کی طبعیت میں نئی باتیں سوچنے کی صلاحیت تھی۔ ان کا حافظہ تیز تھا۔ کتابیں پڑھتے تو اہم باتوں کو یاد کر لیتے۔ کلام میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے جس کی سند نہ ہو۔ غالبؔ کم بات کرتے تھے لیکن جب بھی بات کرتے پر لطف گفتگو کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ حالیؔ نے ان کے مزاج میں پائے جانے والی ظرافت کو دیکھ کر لکھا کہ انہیں ''حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف'' کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ حسن بیان' حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا غالبؔ کی تحریر و تقریر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ غالبؔ نے اپنے احباب سے جو پر مزاح گفتگو کی اس دوران ان کے کئی لطائف مشہور ہوئے۔ ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ گرمی کے موسم میں تھا مرزا روزے نہیں رکھتے تھے۔ لو سے بچنے کیلئے کوٹھری میں بیٹھے مرزا دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا آزادؔ نے ان سے پوچھا مرزا ہم نے سنا تھا رمضان میں شیطان بند رہتا ہے۔ آج اس بات پر یقین نہیں آتا مرزا نے کہا بات بالکل صحیح ہے لیکن جس جگہ شیطان بند رہتا وہ جگہ یہی ہے۔ رمضان کے بعد قلعہ گئے تو بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے۔ غالبؔ نے جواب دیا ایک نہیں رکھا۔ اس طرح غالبؔ کی ہر بات لطف سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ غالبؔ وضع دار انسان تھے۔ پالکی میں بیٹھ کر باہر نکلتے جوان سے نہیں ملنا چاہتا وہ بھی اس سے نہ ملتے۔ غالبؔ کی غذا اچھی تھی انہیں گوشت بہت پسند تھا۔ غذا میں انڈے' شامی کباب' روٹی وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ پھلوں میں آم بہت پسند تھے۔ لوگوں سے تقاضہ کر کے اچھے اچھے آم منگواتے تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ کے ساتھ آموں کے باغ میں ٹہل رہے تھے وہ آموں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا کیا دیکھ رہے ہو' غالبؔ نے کہا کہ میں نے سنا تھا کہ دانے دانے پہ کھانے والے کا نام ہوتا ہے۔ دیکھ رہا ہوں کہ ان آموں پر میرا نام کہاں ہے؟ مرزا کی یہ گفتگو سن کر بادشاہ نے آموں کی ٹوکری مرزا کے گھر بھجوادی۔ ایک مرتبہ ان کے دوست نے دیکھ کر کہا مرزا گدھا بھی آم نہیں کھا رہا ہے۔ غالب نے کہا کہ بے شک گدھے آم نہیں کھاتے۔ آم کی خصوصیات بیان کرنے کیلئے کہا گیا تو مرزا نے کہا کہ آم میٹھا ہو اور بہت ہو۔

مرزا کی شخصیت کا اک منفی پہلو یہ بھی تھا کہ وہ شراب پیتے تھے لیکن حالیؔ کہتے ہیں کہ مرزا مقدار سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ اور شراب میں گلاب کا عرق ملا کر پیتے تھے اس سے شراب کا اثر کم ہو جاتا ہے۔

الطاف حسین حالیؔ نے یادگار غالب میں غالبؔ کے اخلاق و عادات' لوگوں کے ساتھ ان کے برتاؤ' ان کی سخاوت' رحم دلی' ہمدردی و غمخواری' مزاج کی ظرافت وغیرہ خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جنہیں اپنا کر انسان سماج میں بہتر مقام حاصل کر سکتا ہے۔ انسان اگر اچھائی کو اختیار کرے اور برائی ترک کرے تو اس کی ذات لوگوں کیلئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ غالبؔ کی شخصیت کے یہ مثبت پہلو لوگوں کیلئے یقیناً مشعل راہ ہوں گے۔

غالب کی مکتوب نگاری:

غالب نے دوران حیات اپنے دوست احباب کو کافی خط لکھے۔انہوں نے مکتوب نگاری کا نیا انداز اختیار کیا۔وہ خط ایسے لکھتے تھے جیسے دو لوگ بیٹھے آپس میں بات کر رہے ہوں۔آداب والقاب کو بالکل ترک کر دیا اور کبھی صاحب اور کبھی میاں کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ان کے مکاتیب کے مجموعے اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کے نام سے شائع ہوئے۔ انہوں نے اپنے جن دوست احباب کو خط لکھا تھا ان میں مرزا ہرگوپال تفتہ، منشی نبی بخش حقیر، منشی جواہر سنگھ جواہر، محمد زکریا خاں زکی، منشی عبداللطیف، عبدالحق، سعدالدین خاں شفق، قاضی عبدالجلیل جنون، سید بدرالدین احمد کاشف المعروف بہ فقیر، نواب یوسف مرزا، شاہ عالم، سید غلام حسنین قدر بلگرامی، یوسف علی خاں ناظم، حکیم غلام غوث، نجف خاں بابو ہرگوبند سہائے نشاط، میر مہدی مجروح، مرزا شہاب الدین، احمد ثاقب، چودھری عبدالغفور سرور، نواب زین الدین خاں بہادر عرف کلن میاں، علاء الدین خاں علائی، مرزا حاتم علی مہر، منشی شیونرائن آرام، میر افضل علی عرف میرن صاحب، غلام غوث خاں بے خبر، مہاراجہ سردار سنگھ والی بیکانیر، محمد نعیم آزاد صاحب، عالم مارہروی، نواب حسین مرزا، ذوالفقارالدین حیدر خاں، میاں دادخاں سیاح، احمد حسن قنوجی، منشی محمد ابراہیم خلیل، منشی سخاوت حسین، قاضی عبدالرحمٰن تحسین، حکیم سید احمد حسن مودودی، عباس رفعت، قاضی محمد نورالدین حسین فائق، مفتی محمد عباس، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، رخشاں، منشی نولکشور، میر سرفراز حسین، مرزا عباس بیگ، محمود مرزا، منشی حبیب اللہ ذکا، نواب میر غلام باہا خاں، مردان علی خاں رعنا، میر بندہ علی خاں عرف مرزا امیر، نواب امین الدین احمد خاں، مرزا قربان علی بیگ خاں سالک، منشی سیل چند، عبدالرزاق شاکر، حکیم غلام مرتضٰی خاں، سید سجاد مرزا، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، میر ولایت علی خاں، نواب کلب علی خاں، ماسٹر پیارے لال آشوب، حکیم غلام رضا خاں، حکیم ظہیرالدین خاں، مرزا شمشاد علی بیگ رضوان، ضیاء الدین احمد خاں ضیاء، محمد محسن صدرالصدور، نواب میر ابراہیم علی خاں وفا، مولوی نعمان احمد، سید محمد عباس علی خاں بیتاب، فرقانی میرٹھی، محمد حسین خاں، شہزادہ بشیرالدین توفیق، مولانا احمد حسین مینا مرزاپوری، مرزا باقر علی خاں کامل، شاہ فرزند علی صوفی منیری، منشی ہیرا چند، بہاری لال مشتاق، مظہر علی، شیخ لطیف احمد بلگرامی، میر سرفراز حسیب، تفضّل حسین خاں، خلیفہ احمد علی، احمد رامپوری، مرزا رحیم بیگ، عزیز صفی پوری، یوسف علی خاں عزیز، منشی غلام بسمل اللہ، مرزا امیرالدین خاں فرخ مرزا، مولوی کرامت علی، حکیم محبّ علی، میر احمد حسین میکش، منشی کیول رام ہوشیار، منشی ہیرا سنگھ، مولوی عبدالغفور خاں نساخ، منشی سید اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی۔

مرزا اسداللہ خاں غالب کے شاگرد

غالب کے کئی شاگرد تھے۔ان کے اکثر شاگرد اپنے استاد سے کلام کی اصلاح لیتے تھے۔ان کے شاگردوں کے نام اس طرح ہیں۔

(1) آرام، منشی شیونرائن (2) آذر، نواب ذوالفقار علی خاں (3) آشوب، رائے بہادر ماسٹر پیارے لال (4) آگاہ، نواب سید محمد رضا دہلوی معروف بہ احمد مرزا (5) احسن، حکیم مظہر حسن خاں رامپوری (6) اخگر، فتح یاب خاں رامپوری (7) ادیب، مولوی سیف الحق دہلوی (اسمٰعیل، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی (9) انور، سید شجاع الدین عرف اُمراؤ مرزا دہلوی (10) غلام، منشی غلام اللہ (11) بیتاب،

عباس علی خاں (12) بیدل، حبیب الرحمٰن (13) بے صبر، لالہ بالمکند سکندر آبادی (14) پیر جی، قمر الدین دہلوی (15) تپش، مولوی
سید مدد علی (16) تفتہ، منشی ہر گوپال (17) توفیق، محمد بشیر الدین (1 ثاقب، نواب شہاب الدین احمد خاں (19) جنون، قاضی
عبدالجمیل (20) جوہر، حکیم معشوق علی خاں شاہجاپنوری (21) جوہر، جواہر سنگھ دہلوی (22) حالہ، خواجہ الطاف حسین (23) حباب،
پنڈت اُمراؤ سنگھ لاھوری (24) حزیں، میر بہادر علی دہلوی (25) حقیر، منشی نبی بخش (26) خضر، مرزا خضر سلطان (27) خورشید،
خورشید احمد (2 ذکاء ؒ، مولوی حبیب اللہ خاں (29) رابط، دربھگہ (30) راضی، بہاری لال جی اکبر آبادی (31) رسوا، شیخ
عبدالحمید غازی پوری (32) رضوان، مرزا شمشاد علی بیف (33) رضوان، نواب رضوان علی خاں (34) رعنا، نواب مُراد علی خاں
(35) رنج، حکیم محمد فصیح الدین میرٹھی (36) رنجور، نواب علی بخش خاں (37) روشن، دیوان روشن لال دہلوی (3 ذکی، حافظ سید محمد
ذکریا خاں دہلوی (39) سالک، مرزا قربان علی بیگ (40) سجاد، نواب سید سجاد مرزا دہلوی (41) سخن، خواجہ محمد فخر الدین حسین دہلوی
(42) سرور، چودھری عبدالغفور مارہروی (43) سروش، عبدالوہاب خاں رامپوری (44) سوزاں، حبیب الدین احمد سہارنپوری
(45) سیاح، میاں داد خاں اورنگ آبادی (46) شاداں، مرزا احسن علی خاں دہلوی (47) شائق، خواجہ فیض الدین عرف خواجہ حیدر
خاں، ڈھاکہ (4 شوخی، نادر شاہ خاں رامپوری (49) شاکر، مولوی عبدالرزاق اکبر آبادی (50) عالم، شاہ عالم مارہروی (51) شفق،
نواب سعد الدین احمد خاں (52) شیفتہ، نواب محمد مصطفٰی خان دہلوی (53) صوفی منیری، شاہ جلیل الرحمٰن حسین عرف شاہ فرزند علی
(54) صوفی، حکیم محمد علی نجیب آبادی (55) صفیر، سید فرزند احمد بلگرامی (56) صادق، عزیز، محمد عزیز الدین دہلوی (57) طرار، میرزا
سرفراز حسین (5 ظفر، سراج الدین بہادر شاہ ثانی (59) ظہیر، لالہ پیارے لال (60) طالب، مرزا سعید الدین احمد خاں دہلوی
(61) عارف، نواب زین العابدین خاں دہلوی (62) عاشق، محمد عاشق حسین خاں اکبر آبادی (63) عاشق، ماسٹر شنکر دیال اکبر آبادی
(64) عاشق، منشی محمد اقبال حسین دہلوی (65) عاقل، محمد رضا علی خاں رامپوری (66) عالم، شاہ عالم (67) عالم، میر عالم علی خاں (6
عزیز، مرزا یوسف علی خاں (69) علائی، نواب علاء ؒالدین خاں (70) فنا، حکیم میر احمد حسن (71) قدر، سید غلام حسین بلگرامی
(72) سالک، کاشف، سید بدر الدین احمد دہلوی (73) کامل، مرزا باقر علی خاں دہلوی (74) کرامت، سید شاہ کرامت حسین ہمدانی
گیاوی (75) محو، نواب غلام حسین خاں دہلوی (76) مجروع، میر مہدی دہلوی (77) مداح، سوزاں، شیخ محمد صادق (7 مشتاق، منشی
بہاری لال دہلوی (79) مفتوں، پنڈت لچھمی نرائن (80) مقصود، سید مقصود عالم رضوی (81) منشی، منشی سیل چند دہلوی (82) مونس،
پنڈت شیو جی رام (83) میکش، میر احمد حسین دہلوی (84) میکش، میر ارشاد احمد دہلوی (85) ناظم، نواب ناظم علی خاں رامپوری
(86) نامی، منشی شیو دیبی دیال (87) نشاط، ہر گوبند سہائے ماتھر (8 نیئر، نواب ضیاء ؒالدین خاں دہلوی (89) وفا، نواب ابراہیم علی
خاں (90) ولی، مولوی اموخاں دہلوی (91) ہشیار، کیول رام (92) رمزر، مرزا فخر والدین معروف بہ میرزا فخرو

تصانیفِ غالب

غالب کی تصانیف کی تفصیلات اس طرح ہیں۔

درفش کاویانی ()،لاھور،مطبوعات یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی،1969ء ؁ ،294ص ()

فالنامہ(1876ء ؁-8صفحات) دہلی

دعائی صباح ()،لکھنوٗ،مطبع نولکشور، ت ن،26ص (فارسی مثنوی)

غالب نے یہ مثنوی اپنے بھانجے میرزا عباس بیگ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر. لکھنوٗ کی فرمائش پر لکھی

سبدِ باغِ دودر (کتابت 7جولائی 1870ء ؁ میں مکمل ہوئی)(فارسی تصانیف)

مخطوطات:-(1)قلمی نسخہ پروفیسر سید وزیر حسن عابدی،صدرشعبہ فارسی و عربی دہلی یونیورسٹی

قاطع برہان ()،لکھنوٗ،مطبع نولکشور،1862ء ؁ ،97ص (فارسی تصانیف)

دستنبو()،مطبع مفید خلائق،نومبر 1858ء ؁،88ص (فارسی تصانیف)ناشر،1865ء ؁ (1871ء ؁-)ناشر،1871ء ؁ ()

تیغِ تیز ()اکمل المطابع،1867ء ؁ (اُردو تصانیف)

مہرِنیم وز ()فخر المطابع،1271ھ،116ص (فارسی تصانیف)

غالب نامہ ()مطبع محمدی. دہلی،16اگست 1865ء ؁ (اُردو تصانیف)

پنج آہنگ ()مطبع سلطانی،4اگست 1849ء ؁ ،(فارسی تصانیف)،دہلی،مطبع داراسلام،اپریل1853ء ؁

مخطوطات:-(1)ہارڈنگ لائبری. دہلی (2)رضالائبریری. رامپور

دیوانِ اُردو ()سیّد المطابع،اکتوبر 1841ء ؁ ،108ص (شاعری)

(مئی 1847ء ؁-1159اشعار)مطبع دادالسلام. دہلی (29جولائی 1861ء ؁-88صفحات 1796اشعار)مطبع احمدی. دہلی () (جون 1862ء ؁-104 صفحات 11796اشعار) مطبع نظامی . کانپور(1863ء ؁-- 146صفحات) مطبع مفید خلائق. آگرہ (1873ء ؁ -103 صفحات) نولکشور پریس. لکھنوٗ(1877ء ؁ -103 صفحات) نولکشور پریس. لکھنوٗ (1882ء ؁ -72 صفحات)مطبع میسور پریس. دہلی (1883ء ؁ -103 صفحات) نولکشور. لکھنوٗ (1887ء ؁ -84 صفحات) مطبع نامی . لکھنوٗ (1887ء ؁ -) مطبع منشی نولکشور . کانپور (1901ء ؁ -72 صفحات) مطبع نامی . لکھنوٗ (1903ء -104 صفحات)مطبع منشی نولکشور(1905ء ؁ -103 صفحات)مطبع مفید عام پریس.لاہور(1912ء ؁ -104 صفحات) مطبع مفید عام پریس.لاہور(1914ء ؁ -120 صفحات)مطبع مجیدی. کانپور(1914ء ؁ -116 صفحات)مطبع نامی. لکھنوٗ (1914ء ؁ -104 صفحات)مطبع منشی نولکشور(1919ء ؁ -122 صفحات)مطبع مفید پریس.لاہور(1919ء ؁ -353

صفحات)مطبع گلزارِمحمدی اسٹیم پریس. لاہور(دیوانِ غالب-نسخہ؟ حمیدیہ 1921ء ۔ -145+342 صفحات)مطبع مفیر عام اسٹیم پریس. آگرہ(دیوانِ غالب-نسخہ؟ حمیدیہ 1921ء ۔ -24+342 صفحات)

قادرنامہ(1864ء ۔-)(اُردوتصانیف)

مخطوطات:-(1)رضالائبریری. رامپور

اُردوے معلّٰے(MuallaiUrdu)اکمل المطابع،6مارچ1869ء ۔ ،صفحات(خطوط-اُردوتصانیف)

اُردوے معلّٰی (6 مارچ 1869ء ۔-)اکمل المطابع(11 فروری 1891ء ۔-) اکمل المطابع (اپریل 1899ء ۔-56 صفحات)مطبع مجتبائی. دہلی(1927ء ۔)ناشر،(رام نرائن لعل بک سیلر. الہ آباد،1952ء ۔ ،صفحات438+94()

عودِ ہندی(27اکتوبر1868ء ۔-)مطبع مجتبائی. میرٹھ(خطوط-اُردوتصانیف)

نادرات غالب(1949ء ۔-)(اُردوتصانیف)

نکاتِ غالب ورقعاتِ غالب(فروری1867ء ۔-)

سبدِچین(اگست1867ء ۔-)مطبع محمدی(اپریل1938ء ۔--807اشعار)مکتبہ جامعہ لمٹیڈ. دہلی(فارسی تصانیف)

کلیاتِ نظمِ فارسی (1845ء ۔-506 صفحات 6672 اشعار)مطبع دادِاسلام. دہلی (1863ء ۔ - 10424 اشعار)مطبع نولکشور. (فارسی تصانیف)

غالبؔ کی شاعری کی خصوصیات:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب کے بارے میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں،''غالب زبان اور لہجے کے چابک دست فنکار ہیں۔اردو روزمرہ اور محاورے کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کی سادگی دل میں اتر جاتی ہے۔''عبدالرحمٰن بجنوری لکھتے ہیں کہ،''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں''وید مقدس''اور''دیوان غالب''۔''

اردو شاعری میں مرزا غالب کی حیثیت ایک رخشاں ستارے کی سی ہے۔انہوں نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی۔اسے نئے نئے موضوعات بخشے اور اس میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی۔ان کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات جا بجا ملتے ہیں۔غالب ایک فلسفی ذہن کے مالک تھے۔انہوں نے زندگی کو اپنے طور پر سمجھنے کی بھرپور کوشش کی اور ان کے تخیل کی بلندی اور شوخی فکر کا راز اس میں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

غالب انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔اس کے بنیادی معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔اس کی ان گنت گتھیوں کو سلجھا دیتے ہیں۔انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔اور نظام کائنات

میں اس کو نئے آسمانوں پر اڑاتے ہیں۔ غالب کی شاعری اس اعتبار سے بہت بلند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کے انہیں عناصر نے اُن کو عظمت سے ہمکنار کیا ہے۔ لیکن جس طرح ان کی شاعری میں ان سب کا اظہار و ابلاغ ہوا ہے۔ وہ بھی اس کو عظیم بنانے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب کی شاعری کا اثر حواس پر شدت سے ہوتا ہے وہ ان میں غیر شعوری طور پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اسی ارتعاش کی وجہ سے اس کے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن پر اس قسم کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ ان کے موضوع میں جو وسعتیں اور گہرائیاں ہیں اس کا عکس ان کے اظہار و ابلاغ میں بھی نظر آتا ہے۔ ان گنت عناصر کے امتزاج سے اس کی تشکیل ہوتی ہے۔

غالب کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا منطقی اور استدلالی انداز بیان ہے بقول پروفیسر اسلوب احمد انصاری: ''یعنی غالب صرف جذبات کا تجزیہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان میں باہمی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محبت ان کے لیے کوئی ایسا جذبہ نہیں جو فطری طریقے سے دلکش محاکات میں ڈھل جائے۔ بلکہ یہ ایک گرم تیز رو ہے جو پوری شخصیت کے اندر انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ غالب صرف اشاروں سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے نرم و لطیف، احساسات و کیفیات کا تجزیہ کرتے اور ان پر استدلال کرتے ہیں۔''

غالب کے اس اندازِ بیان کو سمجھنے کے لئے یہ اشعار ملاحظہ ہوں کہ استدلال کا یہ انداز کس طرح شاعر کے جذبات و احساسات کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

قول محال کا استعمال: غالب نے قول محال کے استعمال سے بھی اپنی شاعری میں حسن و خوبی پیدا کی ہے۔ قول محال سے مراد یہ ہے کہ کسی حقیقت کا اظہار اسطرح کیا جائے کہ بظاہر مفہوم عام رائے کے الٹ معلوم ہو مگر غور کریں تو صحیح مفہوم واضح ہو۔ قول محال دراصل ایک طرف ذہنی ریاضت ہے۔ اس سے ایک طرف اگر شاعر کی قوتِ فکر کا انحصار ہوتا ہے تو دوسری طرف قاری کو بھی ذہن و دماغ پر زور دینا پڑتا ہے۔ اس سے شاعر لطیف حقائق کی طرف اشارہ ہی نہیں کرتا بلکہ حیرت و استعجاب کی خوبصورت کیفیات بھی پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں غالب کے اشعار دیکھیں:

ملنا تیرا گر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

تشکک پسندی: غالب کی شاعری میں تشکک پسندی کا پہلو بہت اہم ہے۔ جو بحیثیت مجموعی غالب کی شاعری کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس کی ایک وجہ غالب کا فلسفیانہ مزاج ہے۔ جبکہ دوسری وجہ غالب کا ماحول ہے۔ غالب نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ ایک ہنگامی دور تھا۔ ایک طرف پرانی تہذیب مٹ رہی تھی اور اس کی جگہ جدید تہذیب اور تعلیم اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ یوں انتشار اور آویزش کے اس دور میں اُن کی تشکک پسندی کو مزید تقویت ملی۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

معانی دار پہلو: حالی نے بڑے زور وشور کے ساتھ غالب کی شاعری کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں معانی کی مختلف سطحیں موجود ہیں۔ غالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں۔ جن کی فلسفیانہ، سیاسی اور شخصی تفسیر ہم کر بیک وقت کر سکتے ہیں۔ ایسے اشعار ان ترشے ہوئے ہیروں کی مانند ہیں جن کی آب وتاب اور خیرگی سے ہر زاویہ نگاہ سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک غالب کی کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

رمز وایمائیت: غالب نے اپنی شاعری میں رمز وایمائیت سے بھی حسن پیدا کیا ہے۔ انہوں نے زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں اور گہرے مطالب کو رمز وایما کے پیرائے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اردو غزل کی روایت میں تصوف نے جو رمز وایمائیت پیدا کی اسے اپنے لیے شمع راہ بنایا۔ یوں انہوں نے سیاسی اور تہذیبی، معاشرتی موضوعات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور انفرادی رنگ کے پردے میں اجتماعی تجربات کی ترجمانی کی۔ اس طرح سے رمزیت اور ایمائیت کا رنگ ان کی شاعری پر غالب نظر آتا ہے۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

لطافت خیال اور نکتہ آفرینی: غالب کی شاعری میں نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے غالب عام روش سے ہٹ کر چلنا پسند کرتے تھے۔ شاعری میں بھی الگ روش پر چلنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے لفظی سے زیادہ معنوی نکتہ آفرینی پر زور دیا۔ اس طرح وہ مومن سے ممتاز اور برتر ہیں۔ ان کی نکتہ آفرینی سلاست، گہرائی اور معنویت سے پر ہے۔ اس میدان میں غالب نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اس کی وضاحت اُن کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

زندگی کی محرومیاں: غالب کی ذاتی بھی تلخیوں اور محرمیوں کی زنجیر ہے۔ بچپن میں باپ کی موت، چچا کی پرورش، اُن کی شفقت سے محرومی، تیرہ سال کی ناپختہ عمر میں شادی کا بندھن، بیوی کے مزاج کا شدید اختلاف، قرضوں کا بوجھ۔ ان سب نے غالب کو زمانے کی قدر شناسی کا شاکی بنا دیا۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

طنز ومزاح شوخی وظرافت: شوخی وظرافت غالب کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ عملی زندگی میں وہ خوش باش انسان تھے۔ اسی لیے حالی انھیں حیوان ظریف کہتے ہیں۔ انتہائی کٹھن حالات میں بھی وہ زندہ دلی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ انہیں زمانے نے نجانے کتنے دکھ دیئے لیکن غالب پھر بھی ہنسے جاتے ہیں۔ ان کی ظرافت میں محض شوخی ہی کام نہیں کر رہی، جس طرح غالب کی شخصیت پہلو دار شخصیت ہے اسی طرح غالب کی ظرافت کی بھی متعدد سطحیں ہیں۔ ان کی شاعری میں طنز وظرافت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ غالب کے کچھ طنزیہ اشعار

ملاحظہ ہوں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

زندہ دلی اور خوش طبعی: غالب کی شاعری میں طنزیہ اشعار کے ساتھ ساتھ شوخی اور خوشدلی کا پہلو بھی بڑا نمایاں ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں ایسے اشعار بھی بہت ہیں جنہیں خالص مزاح کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اصل میں غالب زندگی کی چھوٹی چھوٹی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ زندگی کی تلخیوں سے آگاہ ہیں لیکن انہیں زندگی سے والہانہ لگاؤ بھی ہے۔ غالب ایک فلسفی شاعر تھے۔ انہوں نے زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی اور پھر اپنے انکشافات کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کر دیا۔ غالب کے کچھ مزاح سے پھرپور اشعار ملاحظہ ہوں:

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

فارسی زبان کے اثرات: غالب کو فارسی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا۔ اس لئے ان کی شاعری میں فارسی زبان کے اثرات زیادہ ہیں۔ خود فارسی شاعری کے بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ اور فارسی کو اردو سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ فارسی زبان کے اثر سے ان کی زبان میں شیرینی حلاوت اور شگفتگی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ انہوں نے فارسی الفاظ استعمال کر کے اور ان کی ترکیبیں تراش کر نہ صرف اردو زبان کے دامن کو وسیع کیا بلکہ اپنی شاعری میں بھی ایک نکھار اور رعنائی پیدا کر لی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگارِ طاق نسیاں ہو گئیں

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی یہ جو اک لذت ہماری سعی لا حاصل میں ہے

سادہ انداز بیان: مشکل الفاظ و تراکیب کے ساتھ ساتھ غالب کے ہاں آسان زبان بھی موجود ہے۔ غالب نے پیچیدہ مسائل کے اظہار میں عموماً فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہے اور سنجیدہ مضامین کے لیے الفاظ کا انتخاب بھی اسی مناسبت سے کیا ہے۔ لیکن سیدھے سادے اور ہلکے پھلکے مضامین کو غالب نے فارسی کا سہارا لیے بغیر رواں دواں اور سلیس اردو میں پیش کیا ہے۔ زبان کی سادگی ان اشعار کی معنوی قدر و قیمت پر کوئی بڑا اثر نہیں ڈالتی بلکہ ان کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ کیونکہ یہ سادگی شعری تجربے سے ہم آہنگ ہے۔ اس سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

جدت ادا: غالب ذہنی اور طبعی اعتبار سے انفرادیت پسند تھے۔ کسی کی تقلید کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ وبائے عام میں بھی مرنا نہیں چاہتے تھے۔ غالب کی یہی جدت ادا ان کی شاعری میں نئے نئے گل کھلاتی ہے۔ مرزا سے پہلے تمام شعراء کا طریقہ شعر گوئی یہ رہا کہ وہ قدیم

خیالات میں کچھ ترمیم کر کے پیش کر دیتے تھے۔لیکن غالب کے ہاں ایسا نہیں۔اُن کی جدت طبع اور انفرادیت پسندی ہمیشہ نئے نئے خیال ڈھونڈنے پر مجبور کرتی رہی۔چنانچہ اُن کی شاعری میں ہمیں رنگا رنگی اور بوقلمونی محسوس ہوتی ہے۔اگر کبھی مرزا نے کسی قدیم خیال کو ادا بھی کیا ہے تو اس انداز میں کہ شانِ استادی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

تصوف: غالب کوئی باقاعدہ صوفی شاعر نہ تھے اور نہ اُن کو تصوف سے دلچسپی تھی لیکن پھر بھی ان کی شاعری میں بعض مقامات پر تصوف کے عناصر ملتے ہیں جس کی بنیادی وجہ فارسی شاعری میں تصوف کی روایت کی موجودگی ہے اس کے علاوہ اس دور کے حالات بھی تصوف کے لیے خاصطور پر سازگار تھے۔طبیعتیں بھی غم والم اور فرار کی طرف مائل تھیں۔لیکن غالب نے تصوف کو محض رسمی طور پر ہی قبول کیا۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب کا تصورِ عشق

غالب کے ہاں حسن وعشق کے تصورات اگرچہ وہی ہیں جو صدیوں سے اردو اور فارسی شاعری میں اظہار پاتے رہے ہیں۔تاہم غالب کی فطری جدت پسندی نے ان کو صرف انہی موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے ذاتی تجربات ومحسوسات کی روشنی میں حسن وعشق کے بارے میں انہوں نے اپنی انفرادیت قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

غالب کی منتخب غزلوں کی تفہیم

غالب کی تفہیم کا سلسلہ تقریباً ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے کو محیط ہے۔اس عرصے میں کتنے ہی دانشور،شارحین اور محققین نے غالب کی شاعری کی مختلف جہات کا احاطہ کرنے کی کوششیں کیں لیکن کیا ان مفاہیم تک ان کی رسائی ممکن ہوسکی؟ کیا شعر کے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا گیا؟ جو کہ شاعر کا اصل مدعا تھا۔کیا حقیقت میں ان مفاہیم تک شارحین پہنچ سکے جو کہ شاعر بیان کرنا چاہتا تھا؟ کیوں کہ غالب نے اپنے اشعار کی جو شرح خود پیش کی تھی،اسے ان کے لائق وفائق شاگرد یعنی حالی نے قبول نہیں کیا اور حالی نے جو تاویل پیش کی،اس سے مختلف نظم طباطبائی نے شرح پیش کی۔اسی طرح طباطبائی کو حسرت موہانی نے،حسرت موہانی کو بیخود موہانی نے قبول نہیں کیا اور یہ سلسلہ یوں ہی شمس الرحمٰن فاروقی تک جوں کا توں چلا آرہا ہے۔اگر کسی ایک کی تاویل سے دوسرا سخن شناس مطمئن ہوتا تو شاید مزید تشریح کی ضرورت نہ پیش آتی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عہد میں سخن فہم حضرات نے غالب کو اپنے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں کی ہیں اور اس سلسلے کے آئندہ بھی جاری رہنے کے قوی امکانات ہیں۔

دیوان غالب کی پہلی غزل کی تفہیم

غزل کا مطلع اپنے عہد کی روایت سے مختلف ہی نہیں بلکہ منفرد بھی ہے،جس میں غالب نے تنظیم دو جہاں اور انسانی تقدیر پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔یہ ان کی ذہنی حوصلہ مندی اور فکری بلندی تھی ورنہ زمانے کا عام چلن بنے بنائے راستوں پر ہی چلنے کا رہا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

مطلع کو پڑھتے ہی غالب کا یہ شعر:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے　　جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

بے ساختہ ذہن میں آجاتا ہے اور غالب کے ''گنجینۂ معنی کے طلسم'' کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اس شعر میں جس قدر معنوی پہلو پوشیدہ ہیں، اسی قدر صنعتیں بھی موجود ہیں۔ اس طرح کی تہ داری شاعری میں عام نہیں۔ اس شعر کی تشریح خود غالب نے کی ہے کہ ''نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے، اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہ، موجب رنج و آزار ہے''۔

شعر کی گرہ کھولنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے شعر کے کلیدی لفظ کو تلاش کر لیا جائے۔ اس کے ہاتھ آجانے کے بعد شعر کی گرہیں خود بخود کھلتی چلی جائیں گی۔ زیر بحث شعر میں لفظ ''کِس'' کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے بعد ''نقش'' اور ''شوخیِ تحریر'' خاص توجہ کے طالب ہیں۔ اگر ''کِس'' کو خالقِ کونین کا استعارہ تسلیم کر لیا جائے تو شعر کے معنی کسی حد تک واضح ہو جائیں گے لیکن شعر کی معنویت محدود ہو جائے گی۔ ساتھ ہی ''کِس کی'' کے استفہام کا لطف بھی جاتا رہے گا، جو کہ اس شعر کی حقیقی جاذبیت ہے۔ پھر بھی اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ''کِس'' کا اشارہ خالقِ مطلق کی طرف ہی ہے کہ اس نے از راہِ شوخی تصویر کو ناپائیدار بنایا ہے، اسی لیے تصویر اپنی زبان بے زبانی سے فریاد کر رہی ہے کہ جب ہستی کو ناپائیدار ہی بنانا تھا تو اس میں اس درجہ کمال، اس درجہ کشش رکھنا کیا ضروری تھا؟ دنیا کی یہ رنگا رنگی یہ کشش یہ دلفریبی اور موہ کیا ہے؟ جب کہ ہر چیز فانی ہے۔ قدیم زمانے ہی میں کیا آج بھی یہ چلن عام ہے کہ شعری مجموعوں کے آغاز میں حمد، نعت اور منقبت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ غالب نے روش عام سے گریز کرتے ہوئے، دیوان کے پہلے ہی شعر میں تخلیقِ کائنات پر سوالیہ نشان لگایا۔ اس شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غالب کائنات کے فلسفے کو سمجھنا چاہتے ہیں کہ اس کائنات کا راز کیا ہے؟ جہاں ہر شئے مجبور و لاچار دکھائی دیتی ہے اور شاید اس فلسفے کو سمجھنے کے لیے ہی انہوں نے کہا تھا کہ:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟　　ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اب شعر کے اس مفہوم کی طرف رخ کرتے ہیں، جس کا ذکر عموماً کیا جاتا ہے کہ ایران میں رسم تھی کہ فریادی فریاد کے لیے کاغذی لباس پہن کر دربار میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ کیوں کہ کاغذ کی کوئی وقعت نہیں ہوتی، یہ ہوا کے تیز جھونکے سے، آگ کی گرمی سے، حتٰی کہ ذرا سی رگڑ لگنے سے بھی تار تار ہو سکتا ہے، لہٰذا کاغذی پیرہن فریادی کی بے بساطی کی دلیل سمجھا جاتا تھا یعنی اس دنیا میں انسان کی ہستی ٹھیک کاغذی پیرہن کی طرح ہے، جس کی کہ کوئی ساکھ، کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ چوں کہ مصور، تصویر کو کاغذ پر بناتا ہے، جس کا وجود عارضی اور بے بساط ہوتا ہے، اس لیے تصویر اپنے خالق سے جدائی پر فریاد کر رہی ہے۔ زیر بحث شعر کے دوسرے مصرعے ''کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا'' کے ''ہر'' سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس سے تمام جاندار مراد ہو سکتے ہیں لیکن شعور و احساس چوں کہ صرف انسان ہی کو حاصل

ہے، اس لیے ''فریادی'' سے مراد انسان ہی ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت انسان کے علاوہ دوسری کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے، لہٰذا ''شوخیِ تحریر'' سے اگر انسانی ''شعور و احساس'' مراد لیے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ فرشتوں اور تمام جانداروں کو ملحوظ رکھا جائے تو انسان کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے، جو کہ خالق کائنات کی ''شوخیِ تحریر'' کا سب سے بڑا کرشمہ ہے۔

غالب کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے، اس بات کو خاص طور سے ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان کی شاعری کا اصل جوہر استفہام، فلسفہ، فکر کی بلندی اور احساس کا وہ انوکھا پن ہے، جو ہمارے دلوں کو چھو جاتا ہے۔ اس لیے ان کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں مذکورہ باتوں کا لحاظ خصوصی طور پر رکھنا ہوگا۔ اس شعر پر اگر صنائع لفظی اور معنوی کے اعتبار سے غور کریں تو تلمیح، استعارہ، تجاہلِ عارفانہ، تجنیس صوتی اور حسن تعلیل کا ذکر کرنا ناگریز ہوگا لیکن ذہن نشین رہے کہ غالب کی شاعری میں ان چیزوں کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور تفکر و تخیل کی اول۔ اس شعر کے مفہوم کو واضح کرنے میں غالب ہی کا ایک شعر ہماری رہنمائی کچھ اس طرح کر رہا ہے کہ:

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا؛ کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا؟

اس شعر کا پہلا مصرع بالکل واضح ہے اور دوسرا ہماری رہنمائی اس طرح کر رہا ہے کہ میرے وجود نے یا میرے ہونے نے، مجھ کو یعنی انسان کو خوار اور رسوا کیا ہے ورنہ میں تو ''کُل'' کا ''جُز'' تھا مگر افسوس کہ ''کُل'' سے بچھڑنے کے باعث میں کہیں کا نہیں رہا۔ اس شعر کے اور بھی پہلو ہیں مگر ان کی تفصیل کا محل یہ نہیں۔ اب ایک بار پھر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تصویر مصور سے یا ''نقش'' اپنے خالق سے جدا ہونے اور اپنے وجود کے عارضی ہونے کی شکایت کر رہا ہے۔

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

اس شعر کا بنیادی مضمون یہ ہے کہ انتظار محبوب میں رات گزارنا، جوئے شیر لانے کے مترادف یعنی انتہائی دشوار گزار امر ہے۔ اے سخت جان محبوب، میری تنہائی کے بارے میں مت پوچھ کیوں کہ جو کاوشیں، جو تدبیریں اور جو کوششیں میں اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے کرتا ہوں وہ جوئے شیر لانے سے کسی صورت بھی کم نہیں۔ اس شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ جوئے شیر لانے یا کوہ کنی کی تمام مدت میں جو مشکلیں، صعوبتیں اور جو سختیاں فرہاد پر گذریں، وہ مجھ پر ہر رات گذر جاتی ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر انتظار محبوب میں شام کو صبح کرنے کے اپنے عمل کو، کوہکن کی صعوبتوں سے بڑھ کر ثابت کرنا چاہ رہا ہو یا یہ کہ فرہاد پر جو گذری ہو سو گذری ہو لیکن میری مشکل، مجھے تو اس سے بڑھ کر معلوم ہوتی ہے۔ اگر شبِ تنہائی سے دنیاوی زندگی مراد لی جائے تو اس کی صبح کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ کوہ کنی کرنا۔ اگر صبح کو سفید اور شام کو سیاہی کی تمثیل تسلیم کر لیا جائے تو سیاہی کے بطن سے سفیدی پیدا کرنے کے عمل کو جوئے شیر لانے کے مترادف کہا جاسکتا ہے۔

جذبہ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اس شعر کی بنیاد ''حسنِ تعلیل'' پر ہے۔ اس لیے سب سے پہلے حسنِ تعلیل کی تعریف جان لینا مناسب ہوگا۔ ''تعلیل کے معنی ہیں وجہ بیان کرنا، وجہ متعین کرنا۔ یہ اس عمل کی خوبی و ندرت کی مثال ہے جب کہ کسی عمل یا واقعے کے لیے کوئی ایسی وجہ بیان کی جائے جو چاہے

واقعی نہ ہومگراس میں کوئی شاعرانہ جدت ونزاکت ہواور بات فطرت اورواقعے سے مناسبت بھی رکھتی ہوتو اسے حسنِ تعلیل کہتے ہیں''۔ چونکہ 'دَم' لفظ اس شعر میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے، اس لیے یہاں لفظ 'دَم' کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ 'دَم' کے معنی ہیں سانس، روح، جان، تلوار کی دھار، باڑ وغیرہ۔ تلوار کی دھار اندر کی طرف نہیں بلکہ باہر کی طرف ہوتی ہے، جو ایک فطری چیز ہے لیکن غالب نے جس خوبصورتی سے حسنِ تعلیل کی بنیاد پر اس شعر کی بندش کی ہے، اس کا لطف اہلِ نظر ہی جانتے ہیں۔ تلوار کے 'دَم' کو یا تلوار کی دھار کے باہر ہونے کو اس کے قتل کرنے کی آرزو، عاشق کے جذب؟ بے اختیار شوق پر محمول کرنا، شاعرانہ جدت اور فکر کی بالیدگی کا کمال ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ مجھے قتل کرنے کی آرزو میں تلوار اس قدر بے اختیار، بے قابو ہوئی جارہی ہے کہ دمِ شمشیر، سین؟ شمشیر سے باہر نکل آیا ہے۔ محاورہ ''آپے سے باہر ہونا'' کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر غور کریں تو کہا جاسکتا ہے کہ عاشق کو قتل کرنے کے لیے تلوار اس قدر بے اختیار ہوئی جارہی ہے کہ اس کا دم اس کے سینے سے باہر نکل آیا ہے۔

عاشق کے شوقِ شہادت کو دیکھ کر شمشیر کے بے اختیار ہونے میں ایک پہلو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شمشیر، شمشیرِ حقیقی نہ ہوکر محبوب کے ناز وادا کی شمشیر ہو، جس سے قتل ہونے کے لیے عاشق بے قرار ہے کہ کاش میرا محبوب مجھے اپنے عشوہ وغمزے سے قتل کر دیتا تو میرے دل کی مراد پوری ہوجاتی۔

آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

زبان اظہار کا محض ایک ذریعہ ہے۔ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے، اس کا اصل مقصد ان لفظوں اور بین السطور میں پنہاں ہوتا ہے، جن کا کہ وہ استعمال کرتا ہے یعنی اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ فکر وتخیل کی جس سطح سے اس نے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں تک سامع وقاری کی رسائی ان لفظوں کے وسیلے سے ہوجائے، جن کا کہ شاعر نے استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر قاری وسامع کی رسائی فکر کی اس سطح تک ہو ہی جائے، جہاں سے کہ شعر کہا گیا کیوں کہ اس میں قاری وسامع کی بصیرت، سخن فہمی اور لیاقت کا دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر زیرِ بحث میں غالب چیلنج کرتے نظر آتے ہیں کہ:

آپ کی قوت فہم، سخن شناسی اور سخن فہمی کی صلاحیت، خواہ کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کرلے، اپنی لیاقت اور عقل مندی کے گھوڑے خواہ کتنے ہی کیوں نہ دوڑالے مگر میں جس بلندی سے جو بات کہنا چاہتا ہوں، وہاں تک آپ کی رسائی ممکن نہیں ہے اور قطعی نہیں ہے۔ اس موقع پر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ غالب کے ہم عصر انہیں مہمل گو کہا کرتے تھے۔ ممکن ہے اس شعر میں ان حضرات کی طرف غالب کا تخاطب ہو۔ ساتھ ہی اس شعر میں یہ بات بھی پنہاں ہے کہ شاعر کو اپنی شاعری کے معیار اور اس کی دائمیت کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا، جبھی تو انہیں بارگاہ ایزدی میں اپنے ہم عصروں کے لیے یہ دعا مانگنی پڑی تھی کہ:

یارب! نہ وہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ایک پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری شاعری تمہاری سمجھ میں اس لیے نہیں آرہی ہے کہ میں آج کا نہیں بلکہ آئندہ آنے والے زمانے کا شاعر ہوں۔ شاید اسی لیے انہیں یہ کہنا پڑا:

ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج　　　میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

زیرِ بحث غزل کا آخری شعر ہے:

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا　　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیرِ پا یعنی اضطرابی کیفیت، بے چینی اور بے قراری۔ شاعر کہتا ہے کہ قید ہونے کے باوجود میری کیفیت سیمابی ہے اور میرے جوشِ جنوں کے سامنے زنجیر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ گرفتارِ عشق، گرمی عشق سے بے قرار ہے اور عاشق کی آتشِ عشق سے زنجیر موئے آتش دیدہ یعنی بے وقعت ہو کے رہ گئی ہے۔ مذکورہ شعر کے مفہوم سے ملتا جلتا غالب کا ایک اور شعر ہے:

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی　　　یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؟

اب شعر کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ عاشق کو گرفتار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، کیوں کہ عاشق کی گرفتاری سے اس کا جنونِ عشق، نہ ہی کم ہوتا ہے اور نہ ہی فنا ہوتا ہے بلکہ اور فروغ پاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عاشق کی سیمابی کیفیت نے یعنی اس کی آتش زیرِ پائی نے، زنجیر کو پگھلا کر رکھ دیا ہے۔

اب ہم ایک بار پھر جب غزل پر نگاہ ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس غزل کی ابتدا فطرت کے جبر سے ہوئی تھی، جس کا انسان کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ فطرت کے سامنے انسان مجبور و بیبس ہے لیکن مقطعے تک آتے آتے بات اختیار کی منزل تک آ گئی، جہاں انسان کی آتش زیرِ پائی نے فطرت کی زنجیروں کو پگھلا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی مجبوریوں کو موئے آتش دیدہ بنا دیا ہے اور اس طرح فطرت کے جبر کی گرفت ڈھیلی ہوتی نظر آتی ہے، اتنا ہی اس کا اختیار ہے اور بس۔

تفہیم غزل 2

1) **شعر:　　کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ شعر غزل کا مطلع ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں محبوب کے ترکِ تعلق پر شاعر کے جذبات کا ذکر کیا گیا ہے غالبؔ کہتے ہیں کہ محبوب نے اُن سے وفا نہیں کی۔ اس کی جفائیں بڑھتی ہی گئیں۔ محبوب کی بڑھتی ہوئی جفاؤں پر شاعر شدید جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کی جفاؤں اور بیوفائیوں اور اس کی دوری کے غم نے ہمیں زندہ رہنے کا موقع دیا۔ اُس کی یاد ہمیں زندہ رہنے اور تڑپنے کا موقع دیتی ہے۔ ہماری زندگی کے دن غم اور فراق میں گذر رہے ہیں اور ہم نے بھی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر محبوب کا دیدار نہ ہو تو بھی ہم اُس کی یاد کے سہارے زندگی گذارتے رہیں گے۔ انسان کی زندگی میں غم آتے ہیں۔ لیکن فطرت کا یہ قانون ہے کہ ہر غم کے بعد خوشی ضرور آتی ہے۔ غم کے زمانے میں انسان پرُ امید رہتا ہے اور زندگی میں آنے والی خوشیوں کے انتظار میں زندگی کے دن بسر کرتا رہتا ہے۔

مرکزی خیال:۔ محبوب کی بے وفائی اور ترکِ تعلق سے جذبہ عشق اور بڑھ جاتا ہے اور عاشق مزید شدت سے محبوب کو یاد کرنے لگتا ہے اور اپنی زندگی محبوب کی یادوں کے سہارے گذارنے لگتا ہے۔

2)شعر:۔ آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزغم ہائے نہانی اور ہے

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں غم عشق کی شدت کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتے ہیں کہ محبوب سے دوری کے سبب ان کے دل میں جو عشق کی آگ لگی ہے۔اور اس کے سبب غم کی جو شدت بڑھی ہے وہ دوزخ کی آگ سے بھی بڑھ کر ہے۔دوزخ کی آگ انسان کو صرف جلاتی ہے جبکہ غم عشق کی شدت سے نہ صرف انسان بلکہ اس کا دل وجگر اور اس کے جذبات سب جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔اس طرح غم عشق کی آگ دوزخ کی آگ سے بڑھ کر ہے۔شاعر نے اپنے عشق کی شدت کو ظاہر کرنے کیلئے غلو کیا۔درحقیقت یہ ہے کہ دوزخ کی آگ کی شدت کا اندازہ اس زندگی میں نہیں کیا جا سکتا۔لیکن شاعر کو علم ہے کہ دوزخ کی آگ انسان کے جسم وروح کو محسوس ہوتی ہے۔جبکہ عشق کے سبب لگی آگ انسان کو بے خود کر دیتی ہے۔اسی سبب انہوں نے غم عشق کو بڑا ظاہر کیا۔غم عشق کی آگ کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے محبوب کی عظمت کا بھی اظہار کیا۔انہیں ان کا محبوب اتنا عزیز ہے کہ اس کی دوری انہیں اس کیفیت سے دوچار کر رہی ہے۔

مرکزی خیال:۔ محبوب سے فراق کا غم اس قدر شدید ہے کہ عاشق کا دل وجان دوزخ کی آگ سے شدید سلگ رہے ہیں۔اس شعر کے ذریعہ عشق کی شدت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

3)شعر:۔ بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں محبوب کی بڑھتی رنجشوں کا ذکر کیا گیا ہے شاعر کہتا ہے کہ اپنے محبوب کی رنجشیں کئی بار دیکھی ہیں لیکن اس دفعہ رنجشیں کچھ زیادہ ہی ہیں۔عشق میں محبوب کا ناراض ہونا اور روٹھ جانا عام بات ہے اور ایک سچے عاشق کو اپنے محبوب کی تھوڑی سی بے التفاتی بھی رنجش ہی لگتی ہے۔محبوب کی بڑھتی رنجش کا ذکر کر کے شاعر نے اپنے عشق کے شدید جذبے کا اظہار کیا ہے کہ میں تو اپنے محبوب سے بے پناہ عشق کرتا ہوں لیکن وہ اکثر مجھ سے ناراض ہی رہتا ہے اور اب اس کی ناراضگی بڑھ گئی ہے۔ایک طرفہ عشق میں انسان کبھی اپنی عقل اور سوچ سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن کبھی کبھی اسے مرضی کے مطابق کامیابی نہیں ملتی۔تب وہ سوچنے لگتا ہے کہ میں نے کوشش تو بہت کی لیکن حالات ناساز ہونے کے سبب مجھے کامیابی نہیں ملی۔اس شعر میں انسانی جذبات کو اس کیفیت کی طرف غالبؔ نے اشارہ کیا۔

مرکزی خیال:۔ شاعر کو محبوب کی رنجشوں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے۔لیکن اس دفعہ رنجش کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔عشق میں اصرار پر اکثر معشوق لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے جس سے عاشق کی تڑپ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔لیکن پھر بھی وہ معشوق کی رنجشوں سے ناراض نہیں ہوتا اور اسکے عشق کی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔

4)شعر:۔دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں محبوب سے خط حاصل کرنے کے بعد قاصد کی زبانی محبوب سے مزید کسی پیغام کے انتظار کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ اس کے محبوب نے اُسے قاصد کے ذریعہ خط روانہ کیا۔قاصد شاعر کو اس کے محبوب کا خط حوالے کرتا ہے اور اپنے چہرے سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ کچھ زبانی پیغام بھی ہے۔جو شاعر کے محبوب نے شاعر کیلئے قاصد کے ذریعہ روانہ کیا ہے۔قاصد زبانی پیغام نہیں سناتا ہے لیکن شاعر اپنے محبوب کی فطرت سے واقف ہے اور اسی واقفیت کی بناء وہ سوچتا ہے کہ اس کے محبوب نے اس کیلئے کس قسم کے جذبات پر مبنی پیغام دیا ہے۔یہ پیغام محبت کا بھی ہوسکتا ہے اور نفرت کا بھی۔غالبؔ نے یہاں لطیف اشارہ کیا ہے کہ جب معشوق نے اپنے عاشق کو خط لکھا ہے تو خط میں تمام باتیں لکھی جاسکتی ہیں لیکن انسانوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب کسی کو تحریری پیغام روانہ کرتے ہیں تو خط لے جانے والے کو کچھ زبانی پیغام بھی ضرور دیتے ہیں۔غالبؔ نے اس شعر میں اس کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔نامہ بردہ قاصد ہے جو عاشق اور معشوق کے درمیان رابطہ کی کڑی ہے اور عاشق کیلئے معشوق کا خط لاتے ہوئے وہ عاشق کی راحت کا سامان فراہم کرتا ہے کہ چلو معشوق تو نہیں آیا کم از کم نامہ بر نے معشوق کا خط اور کچھ زبانی پیام تو لایا۔

مرکزی خیال:۔ نامہ بر کے ذریعہ محبوب سے خط حاصل کرنے کے بعد شاعر کچھ زبانی پیغام کے منتظر ہیں۔لیکن نامہ بر زبانی پیغام سنانے کے بجائے شاعر کا منہ دیکھتا ہے۔تب شاعر محسوس کرتا ہے کہ نامہ بر پیغام اس لئے نہیں سنا رہا ہے کہ اس کے معشوق نے زبانی پیغام میں اس سے نفرت کا اظہار کیا ہوگا۔

5):۔ **قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم وہ بلائے آسمانی اور ہے**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں ستاروں کے اثرات اور محبوب کی بے وفائیوں اور مظالم کی شدت کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتے ہیں کہ ستارے زمانے کو قطع کرتے ہیں زمانے کے قطع ہونے سے عمریں بھی قطع ہوتی ہیں۔علم نجوم کے تحت کہا جاتا ہے کہ ستاروں کی گردش کا اثر انسانی زندگیوں پر پڑتا ہے اور ستاروں کی مخصوص گردش سے انسانوں پر برے حالات آتے ہیں۔چنانچہ شاعر ستاروں کو ظالم اور بے درد قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح ستارے زندگی میں ظلم ڈھا رہے ہیں اور مجھ سے بے اتفاقی کرتے ہوئے میری امیدوں آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کر رہے ہیں غالبؔ نے ستاروں کی نحوست کو محبوب کے مظالم سے تشبیہ دی ہے اور اپنے عشق کی شدت کو واضح کیا ہے۔

مرکزی خیال:۔ غالبؔ نے محبوب کے مظالم کو بیان کرنے کیلئے علم نجوم کا سہارا لیا اور ستاروں کی نحوست کو محبوب کی بیدردی سے جوڑتے ہوئے اپنے کلام میں ندرت پیدا کی یہ غالبؔ کا ہی کمال ہوسکتا ہے۔

6) شعر:۔ **ہو چکیں غالبؔ! بلائیں سب تمام اک مرگ ناگہانی اور ہے**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ غزل کا مقطع ہے۔

تشریح:۔ غزل کے مقطع میں غالبؔ اپنی زندگی میں آئے بے شمار دکھ درد اور غموں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری زندگی کی

تمامبلائیں مجھ پرآ چکی ہیں، صرف اک بلا آنا باقی ہے اور وہ بلا موت ہے۔ موت ناگہانی آتی ہے اس لئے غالبؔ کہتے ہیں کہ زندگی میں آنے والی تمام بلاؤں کے ختم ہوجانے کے باوجود مجھے اک آخری بلاء کا انتظار ہے۔ جو کبھی بھی آسکتی ہے اس موت کے انتظار میں حقیقت میں میں مستقل بلا میں مبتلا ہوں۔ غالبؔ خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ اس نے ان کی زندگی میں غم زیادہ دیئے ہیں اور خوشی کم دی ہے اور غالبؔ کو اپنی گذری ہوئی زندگی سے اندازہ تھا کہ ان کی موت بھی تکلیف دہ ہوگی۔ اس لئے وہ موت کو بلاء کہتے ہیں۔

مرکزی خیال:۔ موت کا وقت مقرر ہے وہ کبھی بھی آسکتی ہے اور موت کو بلا کہتے ہوئے غالبؔ اس کے منتظر ہیں۔ اور خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ زندگی بلاؤں میں گذری اب موت کا انتظار بھی ایک بلائے مستقبل سے کم نہیں۔

تفہیم غزل 3

1) **شعر:۔ کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زبان کیوں ہو**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں عشق کے سبب ہونے والے غم کے اظہار میں احتیاط کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ عشق میں فریاد کرنا اور رونا شان عشق کے خلاف ہے۔ اسی لئے جب کسی کو دل دے ہی دیا ہے تو پھر آہ وزاری اور فریاد کیسی؟ عشق میں کسی کو دل دے دیا ہے تو عاشق کا سینہ دل سے خالی ہوگیا۔ اب غم کے جذبات کے گھر دل ہی سینہ میں نہ رہا تو شکوہ وشکایت کرنے والی زبان بھی منہ میں نہ رکھیں اور ہر قسم کے شکایت اور شکوہ سے محتاط ہوکر خاموش رہنا چاہئے۔ غالبؔ نے اکثر اپنے کلام میں لطیف خیال پیش کئے ہیں ان کے خیالات میں ندرت ہوتی ہے۔ عشق میں دل دینا محاورہ ہے۔ اس محاورے کے لفظی معنی لیتے ہوئے غالبؔ کہتے ہیں کہ دل دینے سے عشق کا سینہ خالی ہوگیا تو اب زبان کو بھی منہ میں نہ رکھنا چاہئے اور عشق کے سبب ہونے والے غم کی شکایت نہیں کرنا چاہئے۔ اور چپ رہنا چاہئے۔ عشق کے سبب ہونے والے غم کا چرچا کرنا اور محبوب کی شکایت کرنا اپنے عشق کو رسوا کرنے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے سچا عاشق شکایت نہیں کرتا اور غم عشق میں خود ہی ڈوبا رہتا ہے۔

مرکزی خیال:۔ عشق میں دل دینے کے بعد زبان سے گلے شکوے اور شکایت نہیں کرنی چاہئے۔ اور خاموش رہتے ہوئے غم عشق میں ڈوب جانا چاہئے۔ یہی سچا عشق ہے۔

2) **شعر:۔ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟ سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو**

خو = عادت وضع = رہن سہن، عادت

سبک سر = اپنے مقام سے گر جانا۔ سرگراں = ناراض، خفاء

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر کی وضع داری کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس کا محبوب ناراض اور خفا رہنے کی اپنی عادت نہیں چھوڑتا۔ تو میں کیوں اپنے مقام سے گر کر اس سے پوچھوں کہ تم مجھ سے ناراض کیوں ہو۔ عشق میں عاشق اور معشوق میں دوری ہوتی

ہے اکثر معشوق عاشق سے ناراض رہتا ہے۔ عاشق معشوق سے عشق کرتا ہے لیکن اپنی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی معشوق سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم مجھ سے ناراض کیوں ہو؟ عاشق کو احساس ہے کہ میں نے معشوق سے سبب ناراضگی پوچھ لیا اور معشوق نے کچھ جواب دے دیا تو عشق کی وہ گرمی برقرار نہیں رہے گی جو چپ رہنے میں تھی۔ اس کے علحدہ عاشق کی وضع داری سے معشوق سے کھچ پوچھنے کو روکتی ہے۔

مرکزی خیال:۔ معشوق ناراض ہے اور عاشق کو اپنی وضع داری عزیز ہے۔ ایسے میں سبب ناراضگی معلوم نہیں ہوتی۔ عاشق و معشوق میں دوری برقرار ہے لیکن عشق کا سلسلہ جاری ہے اور ہجر کا غم برقرار ہے۔

3) **شعر:۔ کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو! نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو؟**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر کے غم کو فاش کر دینے والے رازداں پر شاعر کے غصے کا اظہار کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں غم عشق میں ڈوبا ہوا ہوں محبوب سے دوری کے سبب غم کی شدت ہے۔ میرے غم کو دیکھ کر مجھ سے ہمدردی اور غمخواری کا اظہار کرنے کے بجائے میرے غم پر افسوس کرنے لگا۔ جس سے میرا عشق ظاہر ہو گیا اور میری ہی رسوائی ہوئی۔ اس لئے شاعر غصے میں کہتا ہے کہ ایسی محبت کو آگ لگے۔ محبت کے سبب پیدا ہونے والے شدید غم کو میں نے ضبط کر کے چھپا رکھا ہے لیکن میرے ضبط کے باوجود میرے غمخوار نے بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے میرے حال پر رحم کا اظہار کر دیا۔ دوسروں کے غم کو ظاہر کر دینے والے بے ضبط غمخوار کے بارے میں شاعر کہتا ہے کہ اُسے اپنی محبت کا رازداں نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ اسے اپنے آپ پر ضبط ہی نہیں۔ اس طرح شاعر کہتا ہے کہ یہ کیسی محبت کی آگ ہے جو عاشق کو تو جلا کر رکھ دیتی ہے لیکن عاشق کے ضبط کرنے کے باوجود دوسروں پر عیاں ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں غمخوار کی شکایت سے زیادہ اپنی محبت کی آگ کے پس پردہ اظہار تذکرہ ہے۔

مرکزی خیال:۔ محبت کے سبب غم کی شدت ہے۔ شدت غم کے باوجود عاشق تو ضبط کر رہا ہے لیکن اس کی بے تابی دیکھ کر غمخوار بے چین ہو جاتا ہے اور فریاد کرنے لگتا ہے کہ شاعر کو اپنی محبت کے رسوا ہونے کا افسوس ہے اور وہ ایسے بے صبر غمخوار کو رازداں بنانا نہیں چاہتا۔

4) **وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں محبوب کی بے وفائی پر شاعر کے شدید جذبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ ان کا محبوب سنگ دل ہے۔ اور شاعر کے چاہنے کے باوجود بے وفائی، سرد مہری اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ محبوب کے اس ردعمل سے عاشق مایوس ہے اور عشق میں ناکامی کے سبب اپنا سر پتھر سے ٹکرا کر پھوڑ لینا چاہتا ہے۔ سر پھوڑنے کیلئے وہ اپنے محبوب کے گھر کے پتھر کے بجائے کوئی اور پتھر منتخب کرنا چاہتا ہے۔ یعنی جب جان دینا ہی مقصود ہو تو محبوب کے در پر سر ٹکرا کر جان دینے کے بجائے کہیں بھی جان دی جا سکتی ہے۔ محبوب کو سنگ دل قرار دے کر سنگ آستاں اور سر پھوڑنا جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے غالبؔ نے اپنے شدید جذبہ اور عشق اور

محبوب کی شدید سرد مہری کی شکایت بڑی خوبی سے کی ہے۔غزل میں بیان ہونے والے عشق کے روایتی مضامین کو غالبؔ نے اپنی جدت اور ندرت سے بلند خیالی عطا کی ہے۔

مرکزی خیال:۔ محبوب کی سنگ دلی اور بے وفائی سے مایوس عاشق اپنا سر پھوڑنا چاہتا ہے۔اس کے لئے وہ محبوب کے در پر ٹکرانے کیلجائے کوئی اور جگہ تلاش کرنا چاہتا ہے۔محبوب کی بے وفائی کی شکایت اس شعر میں بنیادی موضوع ہے۔

5)شعر:۔ **قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم! گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ شعر غالب کے چند مشہور اشعار میں سے ایک ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں غالبؔ نے قفس، آشیاں اور بجلی کے استعارے استعمال کرتے ہوئے ایک بڑے مضمون کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔پرندہ قفس میں ہے وہ دیکھتا ہے کہ باغ میں بجلی گری ہے اس باغ میں اس کا اپنا آشیانہ بھی تھا۔دوسرے دن وہ اپنے قریب بیٹھے پرندے سے دریافت کرتا ہے کہ کل باغ پر بجلی گری تھی اس بجلی کی زد میں کہیں میرا آشیانہ تو نہ تھا۔حقیقت میں قیدی پرندے کا آشیانہ جل جاتا ہے اور ساتھی پرندہ اس حقیقت کو بتانے سے جھجکتا ہے۔ساتھی پرندے کی ہچکچاہٹ پر امید کے ساتھ قیدی پرندہ کہتا ہے باغ میں کئی آشیانے تھے اور بجلی کی زد میں میرا آشیانہ نہیں آیا ہوگا۔اس لئے وہ بے جھجک پرندے کو احوال سنانے کیلئے کہتا ہے۔ غالبؔ نے قیدی پرندے کے ذریعہ ان تمام قیدیوں کے جذبات کی عکاس کی ہے جو اپنے شہر اپنے وطن میں ہوئے کسی حادثے کی خبر سن کر یہ امید رکھتے ہیں کہ اس حادثے کی زد میں ان کا گھر اور ان کے گھر والے نہیں آئے ہوں۔

مرکزی خیال:۔ قفس میں اسیر لوگ کسی حادثے کی خبر سن کر اپنے گھر کی خیریت جاننے کیلئے بے چین رہتے ہیں اور گھر لٹ جائے تو اطلاع دینے والے احتیاط کرتے ہیں۔غالبؔ نے اس شعر کے ذریعہ انسانی فطرت کے ان 2 پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

6)۔شعر:۔ **یہ کہتے ہو، ہم دل میں نہیں، پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمہیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں محبوب سے عاشق کے سوال کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں تمہارے دل میں نہیں ہوں۔ جب تم اس حقیقت کو مانتے ہو کہ میں ہی تمہارے دل میں بسا ہوا ہوں تو تمہارے دل میں میری موجودگی کا اظہار تمہاری آنکھوں سے کیوں نہیں ہوتا۔یعنی دل میں تو محبت ہے لیکن آنکھوں اور بدن کے دیگر اعضاء سے میری محبت اور میری طرف تمہاری اُلفت کا اظہار نہیں ہوتا۔اس شعر کے ذریعہ محبوب سے شاعر کے شکوے کا اظہار ہے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہارے دل میں بسا ہوا ہوں لیکن تمہاری سرد مہری ہے کہ تم اپنی حرکات وسکنات سے میری وفا کا جواب وفا سے نہیں دیتے۔

مرکزی خیال:۔محبوب کی بے وفائی کی شکایت ایک الگ انداز میں کرتے ہوئے غالبؔ کہتے ہیں کہ دل میں محبت ہے لیکن محبوب اس کا اظہار نہیں کر رہا ہے۔

7)شعر:۔ **غلط ہے جذب دل کو شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے۔ نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاش درمیاں کیوں ہو**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں عاشق اور معشوق کے مابین گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے۔ عاشق اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ ہمارے درمیاں جو آپسی کشش ہے اس کا شکوہ نہیں کرنا چاہئے میں تو تمہیں چاہتا ہوں لیکن تم ہی مجھ سے کھینچے کھینچے اور دور رہتے ہو۔ اس طرح کی دوری اختیار کرنے سے کشاکش ہونا لازمی ہے۔ لہذا تم میری محبت کا جواب محبت سے دو تو یہ دوریاں اور یہ نفرتیں پیدا نہیں ہوں گی۔ اور نہ ہی آپسی گلے شکوے ہوں گے۔ اس شعر میں غالبؔ نے محبوب کو شکایت نہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے محبوب سے اپنی شدید محبت کا اظہار کیا ہے۔

مرکزی خیال:۔ شاعر محبوب سے گلے شکوہ نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہماری آپسی کشمکش کی شکایت نہ کی جائے۔ اور آپسی دوریاں ختم کی جائیں۔

8) **شعر:۔ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو؟**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں محبوب کے حسن کو فتنہ قرار دیئے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر اپنے محبوب کے حسن کی تعریف ایک الگ انداز میں کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمہارا حسن خوبصورتی اور خوبصورت ادائیں کسی فتنے سے کم نہیں ہیں۔ تم سے جو بھی محبت کرے گا اُسے برباد کرنے کیلئے تمہارا حسن ہی کافی ہے۔ عاشق کی بربادی کیلئے مزید آسمانی و سلطانی بلاؤں کی ضرورت نہیں۔ انسان جب کسی کے عشق میں ڈوب جاتا ہے تو معشوق کی یاد میں ویران ہو جاتا ہے اسے مزید کسی غم کی ضرورت نہیں۔ اس کی بربادی کیلئے معشوق کی یادیں ہی کافی ہیں۔

مرکزی خیال:۔ شاعر اپنے معشوق کی خوبصورتی کو فتنہ قرار دیتے ہوئے اس کی بالواسطہ تعریف کر رہا ہے۔ اور اس سے شکایت بھی کر رہا ہے کہ تمہارے عشق میں جو برباد ہوا اُسے مزید برباد ہونے کیلئے کسی اور غم کی ضرورت نہیں۔

9) **شعر:۔ یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟**

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر کی اپنے محبوب سے شکایت کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے شکوہ کرتا ہے کہ اس نے مجھ سے محبت کرنے کے بجائے میرے دشمن اور رقیب سے محبت کر لی ہے۔ شاعر کا محبوب اسے اپنے عاشق کی آزمائش تصور کرتا ہے۔ تب شاعر کہتا ہے کہ رقیب سے محبت کرنا آزمائش ہے تو پھر ستانا کسے کہتے ہیں۔ اس طرح کے جذبات کے اظہار سے شاعر نے اپنے محبوب سے شدید وابستگی کا اظہار کیا ہے جبکہ ان کا محبوب روایتی ہے۔ اور شاعر سے عشق کرنے کے بجائے کسی اور سے عشق کرنے لگتا ہے۔ اس سے شاعر کے آبگینہ جیسے دل کو ٹھیس لگتی ہے۔

مرکزی خیال:۔ شاعر کا محبوب رقیب سے محبت کرتے ہوئے اپنے عاشق کو ٹھیس پہونچاتا ہے۔ اور اسے آزمائش تصور کرتا ہے۔ شاعر

معشوق کی آزمائش کی تاب نہیں لاسکتا اور اس کے ستانے سے گھبرانے لگتا ہے۔

10)شعر:۔کہا تم نے کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو؟

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں مترادف الفاظ کی تکرار کے ذریعہ غالبؔ نے محبوب سے شکوہ کیا ہے۔شاعر اپنے معشوق کی اس بات کا تذکرہ کرتا ہے کہ غیر سے ملاقات میں رسوائی کیا ہے۔جبکہ شاعر نہیں چاہتا کہ اس کا معشوق اس کے علاوہ کسی اور سے ملے۔اپنے عاشق کے بارے میں معشوق کی اس بیبا کی پر طنز کرتے ہیں شاعر کہتا ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے ٹھیک کہا ہے۔ایک مرتبہ پھر کہئے۔ لفظوں کی تکرار کے ذریعہ غالبؔ نے اپنے معشوق سے شکوہ اور شکایت میں شدت پیدا کی ہے۔

مرکزی خیال:۔ محبوب کی بے باکی پر عاشق اپنے محبوب سے طنز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ غیر سے ملنے کو ٹھیک سمجھنا کیا ٹھیک ہے؟

11)شعر:۔ نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

حوالہ:۔ یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ غزل کا مقطع ہے۔

تشریح:۔ غزل کے مقطع میں غالبؔ نے اپنے محبوب کے تئیں اپنے روئے کو غلط قرار دینے کی کوشش کی ہے۔اس غزل کے سبھی اشعار میں غالبؔ نے اپنے محبوب کو بے وفا' بے مہر' بے مروت قرار دیا ہے اور اسے اس طرح کے طعنے دیئے ہیں لیکن ان طعنوں کے باوجود ان کا محبوب ان کی طرف راغب نہیں ہوا۔ چنانچہ ہمت ہار کر غالبؔ کہتے ہیں کہ میں نے محبوب کو طعنے دے کر اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔لیکن طعنے دینے سے کام نہیں چلا اور وہ مجھ پر مہربان دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ اگر محبوب کو بے مہر کہوں گا تو وہ میری خلاف ورزی کر کے مجھ پر مہربان ہو جائے گا۔لیکن وہ میرے فریب میں نہیں آیا۔اور بے وفائی کے اپنے روئیے پر اڑا رہا۔محبوب کی اس فطرت کو شاعر نے اس شعر کے ذریعہ اجاگر کیا ہے۔

مرکزی خیال:۔ شاعر محبوب کو طعنے دے کر سدھارنا چاہتا ہے لیکن شاعر کے طعنوں کے باوجود محبوب کی بے مروتی برقرار ہے۔

کتابیات

۱۔ یادگار غالب الطاف حسین حالی

۲۔ دیوان غالب غالب

۳۔ شرح دیوان غالب نظم طباطائی

۴۔ مضامین انٹرنیٹ

☆☆☆☆☆☆☆